مذہب اور سائنس

از ڈاکٹر نذیر احمد، صدر پاکستان اکیڈمی آف سائنس

مترجم:۔ الطاف جاوید

(کافی دن ہوئے روزنامہ ڈان" (کراچی) میں یہ مکتوب شائع ہوا تھا۔ یہاں اس کا اردو ترجمہ دیا جارہا ہے۔ مدیر)

میں" مذہب اور سائنس " کے عنوان سے آپ کے فکر انگیز اداریوں پر، خاص کر ۲ر دسمبر ۱۹۵۷ء کے شمارے میں شائع ہونے والی قسط پر چند بے لاگ خیالات آپ کے مؤقر روزنامہ میں اشاعت کے لئے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ان خیالات کا اظہار اس حقیقت کے پیش نظر ضروری سمجھا گیا ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں، جس میں جدید سائنس کا تعارف مقابلتاً ایک حالیہ واقعہ ہے اور جہاں قدامت پرستی، توہمات اور تعصب کی طاقتیں ابھی نسبتاً قوی ہیں۔ سائنسی علم کی نوعیت اور وسعت، جدید معاشرے میں اس کے صحیح مقام کے متعلق بہت سے غلط تصوّرات رائج ہیں اور انسان کی فلاح و ترقی کے لئے اور زندگی کی سرّیت اور رموزِ کائنات کی تفہیم میں سائنسی علم جو اہم کردار ادا کرتا ہے، اسے صحیح طور پر سمجھا نہیں جاتا۔ جب تک ایک صحیح تصویر پیش نہیں کی جاتی، یہ غلط تصوّرات خود معاشرے کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں اور اس طرح معاشرہ جہالت، ابتری اور زوال پذیری میں مبتلا رہتا ہے، جب کہ زیادہ ترقی یافتہ اور روشن خیال معاشرے بہت آگے نکل جاتے ہیں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے فطرت کے وسائل اور طاقتوں کو تسخیر کرکے اپنے افراد کی زندگیوں کو مالا مال کر دیتے ہیں۔

اپنے اداریہ میں آپ نے یہ اعتراف کیا ہے کہ انسان نے سائنس کی مدد سے تھوڑے سے عرصہ میں فطرت کے بنیادی قوانین کے انکشاف و تفہیم میں بہت لمبی مسافتیں طے کی ہیں۔ کیونکہ جدید سائنس کا آغاز گلیلیو اور نیوٹن سے ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے سائنس کی محدودیت پر، خاص کر حیاتیاتی شعبوں میں (یعنی رازِ تخلیق

اور اصل حیات کے متعلق) سائنس کی نارسائیوں پر بہت زور دینا مناسب سمجھا ہے۔ اس سلسلے میں میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ہمارا علم ان شعبوں میں اتنا ترقی یافتہ نہیں جتنا بے جان مادہ سے متعلق شعبوں میں ہے، پھر بھی ہم توارث کے قوانین، جاندار مادہ کی تناسلی تشکیل، ماحول کے اثرات، مرضیاتی اختلالوں کی نوعیت اور ان کے کنٹرول، شعوری اور لاشعوری ذہن کے عمل کی تفہیم میں اپنے اسلاف سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان موضوعوں میں سے کسی ایک موضوع پر ماضی اور حال میں لکھی ہوئی کتابوں کا بے لاگ اور معروضی مقابلہ میرے بیان کو پُر وثوق ثابت کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ ماضی میں لکھی ہوئی کتابوں میں ایک ابہام اور ظلمت پسندی کا مسلک پایا جاتا ہے۔ جب کہ حال میں لکھی ہوئی کتابوں میں ایک وضاحت اور اُجاگرت پائی جاتی ہے۔ تاہم ان ٹھوس کامیابیوں کے باوجود سچی سائنس اور اس کے پرستار علم کے دوسرے شعبوں کے حامیوں کی طرح قطعیت یا علمِ کُل کا دعوے کبھی نہیں کرتے۔ سچی سائنس کے علم بردار ہر تسخیر کی ہوئی چوٹی کو ایک منزلِ مشاہدہ اور اس سے زیادہ اونچی چوٹی پر پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور وہ پیش قدمی کے جوش اور مہم جوئی میں اتنے محو ہیں کہ ان کے پاس بے شمار قیاسات میں پڑنے کا وقت نہیں۔

اس پہلو سے قطع نظر، کیا میں آپ کی توجہ اُن نفسیاتی اثرات کی طرف مبذول کرا سکتا ہوں، جو سائنس کو محدود اور مجبور ظاہر کرنے سے ہمارے معاشرے پر مترتب ہوتے ہیں۔ یہ اثرات تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ضرور اختیار کر سکتے ہیں۔

لوگوں کا ایک طبقہ یہ نتیجہ نکالے گا کہ چونکہ سائنس زندگی کی سرّیت کو حل کرنے کے قابل نہیں ہے اس لئے اس کا مطالعہ و حصول افادیت سے خالی ہے اور وہ کسی ایسے فلسفہ میں طمانیت ڈھونڈے گا جو حافظ کے اس شعر میں بیان کیا گیا ہے:۔

حدیثِ مطرب و مے گو و رازِ دہر کم تر جُو — کہ کس نکشود و نکشائد بہ حکمت ایں معمّا را

جس کا مطلب یہ ہے کہ "مطرب اور شراب کی بات کرو اور دنیا کے اسرار کو معلوم کرنے کے جھمیلے میں نہ پڑو کیونکہ سائنس اور فلسفہ کی مدد سے اس معمّا کو حل کرنے میں آج تک کوئی شخص کامیاب نہیں ہوا اور نہ آئندہ کامیاب ہوگا۔" یہاں شراب و نغمہ کا مفہوم چاہے لفظی یا استعاری طور پر لیا جائے، اثر یکساں ہوگا۔

لوگوں کا ایک دوسرا طبقہ جو سائنس کے بدلتے ہوئے نظریات کی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھتا، ایسے علم سے منہ موڑ لینے کا فیصلہ کرے گا جسے وہ غلطی سے مسلسل طور پر تغیر پذیر خیال کرتا ہے۔ اور اپنا اعتقاد ایسے

حقائق بن جائے گا جنہیں وہ دائمی، غیر متغیر سمجھتا ہے۔

البتہ لوگوں کا ایک تیسرا طبقہ سائنس کی حالیہ ناپختگیوں کو ہمارے علم کی خامیاں دُور کرنے اور اُس کی حدُود وسیع کرنے کی عظیم ترسعی کے لئے ایک مہمیز تصور کر سکتا ہے۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں آخری طبقہ کی نسبت پہلے دو طبقوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سائنس کی ناپختگیوں اور نارسائیوں پر کسی قسم کا اظہار خیال سائنس کی ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ مغرب میں جہاں سائنس عظیم ترقی کر چکی ہے اور لوگوں کے کچھ طبقوں کے ذہنوں پر مادی اندازِ نظر غالب ہے، اس قسم کا اظہارِ خیال مفید ثابت ہو اور ان کی توجہ انسانی زندگیوں پر اثر انداز ہونے والے دوسرے عوامل اور آورشوں کی طرف مبذول کرائی جا سکے لیکن مشرقی ممالک میں جنہوں نے ابھی سائنس سیکھنے اور اس کے نتائج کو اپنے حالاتِ زندگی کی فلاح و بہبود پر منطبق کرنے کا آغاز ہی کیا ہے۔ اس طرح کے خیالات کا اظہار کرنا ایسا ہے جیسے ایک خالی معدہ شخص کو ہاضم دوائی دی جائے۔

سائنس کی ترقی میں رکاوٹ کا نتیجہ تنگ نظری، مسائل تک پہنچنے میں خارجیت (معروضی نقطۂ نظر) کے فقدان اور تنقیدی صلاحیت کی کمی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ سب سے بڑا نقصان ان ملکوں کی قوت پیدا آوری کو پہنچے گا۔ یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ دنیا کی ساٹھ فی صد آبادی افریشیائی ملکوں میں رہتی ہے۔ لیکن اتنی آبادی دنیا کی ضروریات کا صرف تیس فی صد پیدا کرتی ہے۔ اس لئے ان کا سب سے بڑا مسئلہ ضروریات کے ہر قسم کے سامان اور اشیاء کی پیداوار کو بڑھانا ہے، تاکہ اُن کے عوام کا معیار زندگی موجودہ نیم انسانی سطح سے اونچا کیا جا سکے۔ یہ بھی ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک سائنس اور ٹیکنالوجی کا استعمال وسیع ترین پیمانے پر نہ ہو، اور اس سلسلہ میں کسی قسم کی مرصّع فقرہ بازی یا سوفسطائیت ان حقائق کو نہیں بدل سکتی جو اپنی ساری تابانی کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں۔

دراصل ان ملکوں کے سماجی اور معاشی حالات کا سرسری تجزیہ بھی ظاہر کر دے گا کہ ان کی پیدا آوری راست طور پر اس سطح سے وابستہ ہے جس تک ان میں سائنس کی تعلیم اور اس کا اطلاق کا معیار ترقی ہے اور یہ کہ جن ملکوں نے جہالت، روایات یا جمود کی طاقت کی وجہ سے سائنس اور ٹیکنالوجی کو نظر انداز کیا ہے، وہ اپنے ملکی ذرائع سے بھی کام نہیں لے سکتے، انہیں سائنسی علم اور فنی مہارت کے لئے، اپاہجوں کی طرح دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔

آپ نے اپنے اداریوں میں اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ سائنسی علم کے حصول کے ساتھ ساتھ ہمیں خدا میں اعتقاد رکھنا، خود کو اس کی رضا اور مشیت کے سامنے جھکانا اور اپنے اندر عجز و اطاعت کی روح پیدا کرنی چاہیئے اس خیال سے موافقت کرتے ہوئے میں بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن میں خدا نے انسان کو صرف اس لئے مقام شرف عطا نہیں کیا ہے کہ وہ زمین پر اُس کا خلیفہ ہے اور اسے فرشتوں پر، جنہیں اُس کے سامنے جھکنے کا حکم دیا گیا تھا، برتری حاصل ہے بلکہ اس لئے بھی کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمین پر ہے وہ اس کے افادہ و تسخیر کے لئے ہے۔

"سخّر لکم ما فی السمٰوات والارض" کی آیت سے ہم صرف یہی استنباط کرسکتے ہیں کہ یہ مشیت الٰہی ہے کہ انسان، یعنی زمین پر اللہ کا خلیفہ، فطرت کی طاقتوں اور ذرائع پر قبضہ کرے اور انہیں اپنے استعمال میں لائے چونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی انسان کو یہ مقصد حاصل کرنے کے قابل بناتے ہیں اس لئے اُن کی تعلیم اور اشاعت خدا کے منشائے حقیقی کے عین مطابق ہے۔

آپ نے دوسرے مذاہب پر ہمارے مذہب (اسلام) کی فوقیت کو پُر زور طور پر دہرایا ہے، خاص کر اُس کے نجات بخش اثر، فردکی زندگی کو ہم آہنگ بنانے میں اس کی صلاحیت اور مذہب کی اساس علم پر رکھنے کے لئے اُس کے اصرار کی وجہ سے، اُس کی فوقیت پر تکرار کے ساتھ زور دیا ہے۔ واقعی یہ مشاہدات درست ہیں۔ لیکن وہ اہم سوال، جسے آپ نے نہ اٹھایا ہے اور نہ اس کا جواب ہی دیا ہے۔ یہ ہے کہ ان تمام اوصاف کے باوجود مسلم عوام پس ماندہ کیوں ہیں اور ان کے ملکوں کا شمار عام طور پر دنیا کے غیر ترقی یافتہ ملکوں میں کیوں ہوتا ہے؟ مجھے ڈر ہے کہ ہمیں اس تلخ حقیقت کا سامنا کرنا ہوگا کہ عام طور پر دنیا ہمارے دعوؤں اور اعترافوں کی وجہ سے نہیں بلکہ ہمارے عملی کارناموں کو دیکھ کر ہمارے متعلق اور ہمارے فلسفہ اور فکریات کے متعلق رائے قائم کرے گی جب تک ہم اپنی اس شکست خوردہ اور پچھڑی ہوئی حالت کو قبول نہیں کرتے اور اپنے آپ کو دوسروں کے ساتھ قدم ملانے کی از سر نو جاندار کوشش پر ابھارنے کے لئے اسے ایک تازیانہ کے طور پر استعمال نہیں کرتے۔ خود تعریفی کے تکرار محض سے دو تباہ کن نتائج پیدا ہوں گے۔ پہلا خطرہ یہ ہوگا کہ اس سے دل جمعی اور طمانیت کی ایک ایسی حالت پیدا ہو جائے گی جو ترقی و تعمیر کے لئے ہماری ساری قوت کو نچوڑ لے گی۔ کیوں کہ ہم اس خوش فہمی میں کھو جائیں گے کہ دوسروں سے برتر ہونے اور ایک اعلیٰ فلسفہ رکھنے کی وجہ سے ہم اُن سے کچھ سیکھنے کی حاجت نہیں رکھتے۔ دوسرا خطرہ اس حالت میں یہ ہے کہ اگر سائنس سے متعلق معاملوں کی بحث میں مذہب کو لایا گیا تو اس سے اُن اشخاص کو، جو جدید سائنس سے لاعلم ہیں، یہ اختیار حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ مذہب کے نام پر اپنی مرضی ٹھونسیں اور اپنے طبقاتی

مفادات اور روایتی اقتدار کی حفاظت کے لئے شعوری یا غیر شعوری طور پر سائنس کی ترقی میں روڑے اٹکائیں۔ یہ دو خطرے محض خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ کیونکہ اگر ہم ان حالات کا جائزہ لیں جو ماضی میں ہمارے معاشرے پر مسلط رہے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ عوامل ہمیں نقصان پہنچاتے رہے ہیں اور ہماری پس ماندگی کا سبب بنے رہے ہیں۔ آج ہمیں خود تعریفی اور خود ستائی کی نہیں بلکہ خود محاسبی اور خود تنقید کی ضرورت ہے۔

آپ نے جدید سائنس کو "اندازوں اور مفروضوں کی عظیم الشان سربیہ۔ ریاضیاتی علامتوں اور مساواتوں کی ناقابلِ بیان تجرید" قرار دیا ہے۔ کیا میں بتا سکتا ہوں کہ یہ سائنس کی ایک نامکمل تصویر ہے۔ کیونکہ اس میں سائنس کے اہم ترین بنیادی عناصر یعنی تجربہ اور مشاہدہ کا ذکر نہیں کیا گیا، جن پر جدید سائنس کا حیرت انگیز ڈھانچہ قائم ہے۔ اندازے اور مفروضے، علامتیں اور مساواتیں آج کی سائنس میں واقعی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن آخری مرجع تجربہ اور مشاہدہ ہی ہیں، جو کائنات کے نئے حقائق کے انکشاف میں مدد دیتے ہیں۔ ریاضیاتی علامتیں اور مساواتیں محض آلات ہیں جنھیں سائنس دان استعمال کرتا ہے۔ مفروضے محض مچان ہیں جن پر ڈھانچہ اٹھایا جاتا ہے۔ جوں جوں ہمارا افق وسیع ہوتا جاتا ہے اور ہمارا ادراک گہرا ہوتا جاتا ہے۔ نئے دریافت شدہ حقائق کو جگہ دینے کے لئے پرانے مفروضوں میں ترمیم کرنی پڑتی ہے یا اُنھیں ردّ کر دیا جاتا ہے جس طرح عمارت کی تکمیل کے بعد پرانے مچان کو ہٹا دیا جاتا ہے۔ یہ قدیم سائنس کے مقابلہ میں جدید سائنس کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک ہے۔ قدیم سائنس میں بڑے بڑے مفکروں کے گھڑے ہوئے مفروضوں کے روایتی تقدس کو قائم رکھنے کے لئے حقائق کو اکثر غلط معنی پہنا دیئے جاتے تھے۔ یا انہیں (حقائق کو) نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ کچھ لوگ جو سائنس کے فلسفہ اور سائنسی طریق کی تکنیک سے واقف نہیں ہوتے، غلط طور پر اسے (پرانے مفروضوں کو ردّ کرنے کے عمل کو) سائنس کی ایک کمزوری سمجھتے ہیں۔ دراصل یہ اس کی (سائنس کی) قوت کی ایک سب سے بڑی نشانی ہے۔ کیونکہ یہ عمل سائنس کو تمام اطراف میں پھیلنے اور وقت کے اختتام تک مسلسل ترقی کرنے کے لئے غیر محدود لچک عطا کرتا ہے۔